

حضرت معاویہ اور خلافت و ملکیت

ملک غلام علی صاحب

(۸)

یزید کی ولی عہدی کا مسئلہ | حضرت حجر بن عدی کے قتل کو جائز ثابت کرنے میں اپنا زور استدلال صرف کرنے کے بعد مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے یزید کی ولی عہدی کو جائز قرار دینے میں بھی بڑی دیدہ ریزی سے کام لیا ہے۔ یہ صورتِ حالی فی الواقع بڑی عبرت انگیز ہے کہ مولانا موڈودی کی تردید و تغلیط کے جوش میں مولانا عثمانی صاحب کو اس امر کا احساس نہیں رہا کہ وہ اسلامی قوانین کا حلیہ کس طرح بگاڑ کر دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ پہلے انہوں نے اسلامی حکومت کی انتظامیہ و عدلیہ کی یہ تصویر ہمارے سامنے رکھی کہ اس کے ارکان جو ظلم و عدوان چاہیں، کرتے رہیں، وہ مواخذے سے بالاتر ہیں۔ پھر انہوں نے اسلامی قانونِ بغاوت اور اسلامی حقوقِ شہریت کی یہ تعبیر پیش کی کہ حکومت جس "اٹھتار سپند" کو چاہے باغی قرار دے دے اور اُسے بیان یا صفائی کا موقع دینے بغیر اس کا سرتن سے مجھ کر دے۔ اب یزید کی ولی عہدی کو صحیح ثابت کرنے کے لیے عثمانی صاحب فرماتے ہیں کہ اس بات پر اہمیت کا اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ خلیفہ وقت اگر اپنے بیٹے یا دوسرے رشتہ دار میں نیک نیتی کے ساتھ شرائطِ خلافت پاتا ہے تو اُسے ولی عہد بنا سکتا ہے اور خلیفہ کی نیت پر حملہ کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔ اس کا صاف مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہوا کہ خلافت علیٰ منہاج النبوة اور خاندانی بادشاہت دونوں اسلام میں یکساں طور پر جائز و مباح ہیں اور مسلمانانِ دونوں میں سے جس طرزِ حکومت کو چاہیں اپنا سکتے ہیں۔

اسلام کا نظریہ حکمرانی ایک ایسا اہم اور وسیع موضوع ہے کہ اس پر سیر حاصل بحث کے لیے ایک مضمون کے بجائے ایک کتاب درکار ہے۔ جب تک قرآن مجید، اُسوۂ رسالت اور اُسوۂ خلافت راشدہ کی روشنی میں اس مسئلے کا تفصیلی جائزہ نہ لیا جائے، اسلام کا نظریہ حکومت واضح نہیں ہو سکتا اور مولانا عثمانی

صاحب کے موقف کی غلطی پوری طرح سمجھ میں نہیں آسکتی۔ لیکن یہاں اس محدود مضمون کی تنگ دامنی میری راہ میں حائل ہے۔ تاہم میں قارئین سے درخواست کروں گا کہ اس موضوع پر جو مفصل تحریریں مولانا مودودی کے قلم سے نکل چکی ہیں، انہیں ضرور پڑھ لیں۔ خود ان کی اسی کتاب "خلافت و ملکیت" کے ابتدائی ابواب اسی بحث سے متعلق ہیں۔ مولانا عثمانی صاحب بھی آغازِ تنقید میں ان پر اظہارِ پسندیدگی فرما چکے ہیں۔ اگر وہ بھی یادداشت تازہ کرنے کی غرض سے ان پر دوبارہ نگاہ ڈالیں تو مضائقہ نہ ہوگا۔ اس کے بعد اس موضوع پر اب چند مزید ضروری گزارشات میں بھی پیش کروں گا۔

خلفائے راشدین کا انتخاب | یہ حقیقت تو ظاہر و باہر ہے کہ اسلامی ریاست کے اولین امیر سیدنا و مولانا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے منتخب کردہ یا نامزد کردہ امیر نہ تھے، نہ آپ نے اپنی سسی یا زور سے منصبِ امارت حاصل کیا تھا۔ بلکہ آنحضرت کو احکم الحاکمین اور رب العالمین نے خود خلعتِ نبوت سے سرفراز فرمایا تھا اور آپ کی امارت و امامت آپ کے منصبِ نبوت و رسالت ہی کا ایک جز و لاینفک تھی۔ آنحضرت کے وصال پر البتہ یہ اہم سوال پیدا ہوتا تھا کہ آپ کا خلیفہ اور مسلمانوں کا امیر کون ہو اور اس کی امارت کا انعقاد کیسے ہو؟ اسلام میں اگر سب سے بڑھ کر کسی امیر کو یہ حق پہنچتا تھا کہ وہ اپنے خاندان کے کسی شخص کو اپنا جانشین نامزد کر کے اس کی بیعت اپنی زندگی میں لے لے تو وہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہو سکتے تھے۔ آپ کے خاندان میں خلافت کی اہلیت رکھنے والے منقود بھی نہ تھے۔ یہ کام اگر اسلام میں پسندیدہ کام ہوتا تو اس کی ابتدا کرنے کے سب سے زیادہ حتیٰ و دار خود حضور تھے۔ لیکن سب کو معلوم ہے اوداہل سنت کا اس پر اتفاق ہے کہ آپ نے یہ کام نہیں کیا۔ یہی نہیں بلکہ آپ نے اپنے خاندان سے باہر بھی کسی کو خلیفہ نامزد کر کے اس کی بیعت نہ لی۔ اس مسئلے میں جو مستند ترین احادیث وارد ہیں وہ اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ خود آنحضرت اپنی جانشینی کے معاملے میں ایک گونہ فکر مند تھے اور چاہتے تھے کہ اس ضمن میں امت کی مناسب رہنمائی فرمادیں۔ آپ کے ارشادات سے یہ حقیقت بھی صاف طور پر مترشح ہوتی ہے کہ اگرچہ حضرت ابوبکر صدیق آنحضرت کی نظر مبارک میں منصبِ خلافت کے لیے اہل ترس تھے اور آپ کی خواہش بھی یہی تھی کہ وہی خلیفہ اول نہیں، لیکن ان عہدہ امور کے باوجود آپ نے اپنے جانشین کے لیے نامزدگی (NOMINATION) کا طریقہ اختیار نہیں فرمایا۔ اس بات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ آنحضرت کا وصال ایک عظیم سانحہ تھا اور اس کے بعد خلیفہ کا تقرر امت کے لیے ایک سنگین ذمہ داری اور آزمائش تھی۔ اس مسئلے میں اختلافِ رائے کا پیدا ہونا بھی ناگزیر تھا جس کے

اثرات اب تک امت میں چلے آ رہے ہیں لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ذاتی رائے قائم کر لینے کے باوجود صحابہ کرام کے سامنے اسے ایک باقاعدہ عہد، وصیت یا تجویز کے طور پر پیش نہیں فرمایا تا کہ قدیم زمانہ سے دنیا بھر میں ولی عہد مقرر کرنے کا جو طریقہ رائج و متوارث چلا آ رہا تھا، اس پر کاری ضرب لگے اور امت مسلمہ اپنی ذمہ داری پر انتخاب امیر کے جمہوری و معیاری طریقے کو اختیار کرے۔ صحاح ستہ میں اس مسئلے سے متعلق متعدد احادیث فرمائی ہیں جن میں سے ایک کا ضروری حصہ میں بخاری، کتاب الطب والمرضیٰ سے یہاں پیش کرتا ہوں اس حدیث میں مذکور ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر شدت مرض طاری ہوئی تو آپ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا:

میں نے ارادہ کیا تھا کہ میں ابو بکر اور ان کے بیٹے کو بلاؤں اور ان کے حق میں ولایت عہد کر دوں، مبادا کہ بعد میں مقررین اقرار کریں یا تمنا کرنے والے تنا کریں پھر میں نے جی میں کہا کہ اللہ ان چیزوں کو روک دے گا اور مومنین ان کا دفعہ کریں گے، یا دوسرے الفاظ میں اللہ دفعہ کر دے گا اور مومنین ابا کریں گے۔

لقد هممت اوارث ان امرسل الی ابی بکر و ابنہ و اعمدان یقول القائلون او تینی المؤمنون ثم قلت یا ائی اللہ و یدفع المؤمنون او یدفع اللہ و یا ائی المؤمنون -

یہ حدیث مختلف سندوں کے ساتھ بخاری اور دیگر کتب صحاح کے متعدد مقامات پر وارد ہے۔ اس کا لفظ "المؤمنون" قطعی طور پر ثابت کر رہا ہے کہ خلیفہ کا انتخاب جمہور مسلمین کی آزاد مرضی سے ہونا چاہیے اور اسلام میں انتخاب امیر کے لیے مثالی و معیاری اور افضل و اولیٰ طریقہ یہی ہے۔ چنانچہ حضور کے اس فشا، کو امت نے ٹھیک ٹھیک پورا کیا اور انہی حضرت ابو بکر کو خلیفہ بنایا جنہیں حضور پسند فرماتے تھے۔

حضرت ابو بکر کے بعد مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ حضرت عمر فاروق تھے جن کا تقرر و انتخابات بلاشبہ حضرت ابو بکر کی تجویز کے مطابق عمل میں لایا گیا تھا اور اسی سے بعض حضرات یزید کی ولی عہدی اور بعد کی نسلی و خاندانی حکمرانی کو جائز ثابت کرنا چاہتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے ایک پر دوسری صورت کو قیاس کرنا بالکل غلط ہے، کیونکہ دونوں میں فرق و امتیاز کے متعدد پہلو بالکل تین اور نمایاں ہیں۔ مثلاً پہلا فرق یہ ہے کہ حضرت ابو بکر نے اپنی زندگی میں کوئی ولی عہد مقرر کر کے اس کی بیعت نہیں لے لی بلکہ ان کو اپنا جانشین تجویز کرنے کا خیال اس وقت آیا جبکہ وہ موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ اپنے آخری ایام مرض میں کئی

روز تک آپ مسجد میں نماز کے لیے بھی تشریف نہ لے جا سکے اور جس وقت آپ نے حضرت عثمانؓ کو وصیت کھوانی شروع کی تھی اس وقت آپ اتنے ضعیف و نحیف ہو چکے تھے کہ املاء کرانے کرتے آپ کچھ دیر کے لیے بیہوش ہو گئے۔ اس کے برعکس زبیدی کی ولی عہدی کی تحریک اور مجہم کا آغاز حضرت امیر معاویہؓ کی وفات سے چار سال بلکہ اس سے بھی قبل (۳۵ھ میں) ہو چکا تھا۔ یہ تحریک صرف شام تک محدود نہ تھی بلکہ مروان اور زیاد وغیرہ نے اسے حرمین، بصرے، کوفے میں پوری سرگرمی سے شروع کر رکھا تھا اور تمام لوگوں سے باقاعدہ بیعت لی جا رہی تھی۔ اسی صورتِ حال کو دیکھ کر حضرت عبداللہ بن عمرؓ جیسے محتاط اور مرنجاں مرنج انسان نے بھی صاف کہہ دیا تھا کہ میں ایک وقت میں دو بیعتوں کا قلاوہ اپنی گردن میں نہیں ڈال سکتا۔ البتہ امیر معاویہؓ کے بعد جو بھی خلیفہ تسلیم کر لیا جائے گا، میں اس کی بیعت کر لوں گا۔

دوسرا اتلیازی پہلو یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے تحریر لکھوانے سے چند روز پہلے اربابِ حل و عقد اور اصحابِ شوریٰ سے پوری طرح مشورہ کر لیا تھا۔ چنانچہ ابن سعد صاحبِ طبقات نے آپ کے حالات بیان کرتے ہوئے آخر میں ذکرِ وصیۃ ابی بکر کے زیرِ عنوان لکھا ہے کہ آپ نے حضرات عبدالرحمن بن عوفؓ، عثمانؓ، سعید بن زیدؓ، ابوالاعورؓ، اسید بن حضیرؓ اور متعدد دیگر مہاجرین و انصار سے مشورہ لیا اور سب نے حضرت عمر کے حق میں اچھی رائے کا اظہار کیا۔ پھر بعض لوگوں نے جب حضرت عمرؓ کی سختی کا ذکر کیا تو حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ میں اپنے اللہ سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے بہترین آدمی کو تجویز کیا ہے (بعض دوسری روایات میں ہے کہ عمر میری زری کے بل پر سخت ہو جاتے تھے، اب جب میری جگہ خود بوجھ اٹھائیں گے تو نرم ہو جائیں گے) پھر مجمع عام میں تحریر پڑھ کر سنائی گئی اور لوگوں نے کسی دباؤ اور جبر کے بغیر رضاً و رغبت اس پر اپنی منظوری کا اظہار کر دیا۔ حضرت معاویہؓ کے عہد میں شوریٰ کا وجود اہل حل و عقد کا ادارہ عملاً ختم ہو چکا تھا اور زبیدی کی ولی عہدی کا معاملہ جس طرح طے کیا گیا وہ حضرت ابوبکرؓ کی وصیت سے قطعی طور پر مختلف تھا جیسا کہ آگے چل کر بیان کیا جائے گا۔

تیسری بات جو خاص طور پر قابلِ ذکر ہے وہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے مابین خاندانی قرابت کا کوئی تعلق نہیں تھا اور حضرت ابوبکرؓ نے اپنی وصیت کے ساتھ اس پہلو کی طرف خصوصی اشارہ فرمایا تھا تاکہ اغراض و تمہت کا کوئی موقع باقی نہ رہے۔ امام ابن جریر اپنی تاریخ (جلد ۲، ص ۶۱۸) میں فرماتے ہیں:

اشد ابوبکر علی الناس من کتفہ و حضرت ابوبکرؓ نے درپے میں سے لوگوں کی طرف نجانا

اسما را بنۃ عمیس مسکتہ و هو یقول اترضون
 یمن استخلف علیکم؟ فانی والله ما اوت
 من جهد الرأئی ولا ولایت ذاقدا بنۃ و
 انی قد استخلفت عرب الخطاب فاسمعوا
 له واطیعوا فقلوا اسمعنا واطعنا۔

جبکہ آپ کی اہلیہ، حضرت اسماء بنت عمیس نے آپ کے
 تمام رکھ رکھا تھا۔ آپ فرما رہے تھے کہ کیا تم لوگ میرے
 جانشین پر راضی ہو؟ خدا کی قسم میں نے غور و خوض میں
 کسی نہیں کی اور میں نے اپنے کسی رشتہ دار کو ولایت
 نہیں سونپی۔ میں نے عمر بن خطاب کو خلیفہ تجویز کیا ہے

پس سنو اور مانو۔ لوگوں نے جواب دیا کہ ہم نے سن لیا اور مان لیا۔

اس کے برخلاف امیر معاویہ نے اپنے قریب ترین عزیز یعنی خود اپنے بیٹے کو ولی عہد بنا کر ایک ایسی مثال قائم
 کی جو پہلے موجود نہ تھی، لیکن جو بعد والوں کے لیے دائمی طور پر ایک نظیر اور دلیل بن کر رہی۔ ابن اثیر فرماتے ہیں:
 معاویۃ اول خلیفۃ یابیع لولدہ فی الاسلام (معاویہ پہلے خلیفہ ہیں جنہوں نے اسلام میں اپنے بیٹے کے
 لیے بیعت لی، الکامل ج ۳ ص ۲۶۳)۔ اس کے بعد مسلمانوں میں بیعت کا انتخابی اور شورائی طریقہ بالکل معدوم
 ہو گیا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ایک حکمران نے اپنے بعد علی الترتیب دو دو تین تین ولی عہد مقرر کرنے
 شروع کر دیئے جن میں سے بعض نابالغ بلکہ ماں کے پیٹ میں ہوتے تھے اور ان کے حق میں زبردستی بیعت لی
 جاتی تھی پھر بیعت کے فارمولوں میں بیعت کرنے والے سے یہ الفاظ کہلائے جاتے تھے کہ اگر میں بیعت
 فسخ کروں گا تو میری بیوی پر طلاق مغلظ وارد ہوگی۔ یہی بیعت مکہ اور طلاق مکہ تھی جس کے خلاف امام
 مالک نے اپنی جان پر کھیلے ہوئے صدائے احتجاج بلند کی تھی اور فرمایا تھا کہ یہ کوئی شے نہیں ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کے بعد حضرت عمرؓ کی باری آتی ہے۔ حضرت عمرؓ کے متعلق بعض اوقات یہ بیان کیا
 جاتا ہے کہ انہوں نے استخلاف کے معاملے میں اپنے دونوں پیش روؤں کے بین میں ایک تیسرا مختلف طریقہ
 اختیار کیا اور وہ یہ کہ آپ نے کسی فرد واحد و متعین کو جانشین تجویز کرنے کے بجائے ایک شورائی یا انتخابی
 کونسل تشکیل کر دی تاکہ وہ خلیفہ کا نام تجویز کر کے مسلمانوں کے سامنے پیش کرے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے
 تو حضرت عمرؓ کا طریق استخلاف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ سے زیادہ مشابہ ہے۔ صحیح مسلم کتاب
 الامارۃ، باب الاستخلاف میں حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ جب حضرت عمرؓ پر قاتلانہ حملہ ہوا تو
 لوگوں نے آپ کو جانشین مقرر کرنے کا مشورہ دیا۔ آپ نے متردد ہو کر فرمایا کہ اگر میں جانشین تجویز کروں
 تو یہ بھی ایسے شخص کا کام ہے جو مجھ سے بہتر تھا (یعنی حضرت ابوبکرؓ) اور اگر میں تمہیں اسی طرح چھوڑ دوں تو ایسا
 عمل بھی انہوں نے فرمایا تھا، جو مجھ سے بہتر تھے (یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم)۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ جو

خو اپنے والد ماجد کا انداز بیان دیکھ رہے تھے فرماتے ہیں:

فَعَرَفْتُ اِنَّهُ حِينَ ذَكَرَ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى
اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَيْرَ مُسْتَخْلَفٍ
میں نے جان لیا کہ جب آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم کا ذکر کر رہے ہیں تو پھر آپ کسی فرد واحد کو خلیفہ
تجویز نہیں کریں گے۔

اس کے معاً بعد مسلم کی دوسری روایت میں آتا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ حضرت حفصہ کے پاس گئے تو انہوں
نے فرمایا: کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے والد کسی کو جانشین نہیں بنا رہے؟ حضرت ابن عمرؓ نے جواب دیا کہ
وہ ایسا نہیں کریں گے۔ وہ فرمانے لگیں کہ وہ ایسا ہی کر رہے ہیں۔ حضرت ابن عمرؓ نے قسم اٹھائی کہ وہ اس
معاہدے میں حضرت عمرؓ سے بات کریں گے۔ ایک دن تو حضرت ابن عمرؓ بات کی ہمت نہ کر سکے مگر دوسرے
روز آپ نے عرض کیا کہ ”لوگ کہہ رہے ہیں کہ آپ کسی کو جانشین نہیں تجویز کر رہے۔ اگر آپ کا کوئی چرواہا ہو
اور وہ اپنے گلے کو اس کے حال پر چھوڑ کر آجائے تو آپ دیکھ لیں گے کہ اس نے گلہ صنایع کر دیا۔ مسلمانوں کی
نگہبانی کا معاملہ تو شدید تر ہے۔“ حضرت عمرؓ نے اتفاق کیا، کچھ دیر اپنا سر ٹیکے رہے، پھر حضرت ابن عمرؓ کی طرف
متوجہ ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ کا ذکر کرتے ہوئے وہی کچھ فرمایا جو اوپر کی روایت
میں مذکور ہے۔ اس پر حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں:

فَعَلِمْتُ اِنَّهُ لَمَّا كَانَ لِيَعْدِلَ بِرَسُولِ اللّٰهِ
صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِحْدًا وَاِنَّهُ غَيْرَ مُسْتَخْلَفٍ
پس مجھے معلوم ہو گیا کہ حضرت عمرؓ کسی کو بھی رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم کے برابر جاننے والے نہیں ہیں اور آپ کسی کو
خلیفہ نہیں بنائیں گے۔

ان روایات اور بالخصوص حضرت ابن عمرؓ کی تشریحات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس معاہدے میں حضرت
عمرؓ نے حضرت ابو بکرؓ سے زیادہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ کو اپنے سامنے رکھا ہے اور شخص متعین کے
اختلاف سے اسی بنا پر اجتناب کیا ہے۔ البتہ آپ نے خلافت کے لیے نام تجویز کرنے کا کام ایسے اصحاب
کے سپرد کر دیا جو عشرۃ مبشرہ میں شامل تھے اور اسلامی معاشرے کے کلبائے سیرت سب اور سربر آوردہ ترین
اشخاص شمار ہوتے تھے۔ عشرۃ مبشرہ میں سے دو (حضرت ابو بکرؓ اور حضرت ابو عبیدہؓ) جنت کے مکین ہر چکے تھے
تیسرے خود حضرت عمرؓ، جنت جانے کے لیے پابرجا تھے۔ باقی سات اصحاب بقید حیات تھے جن میں
سے چھ کو آپ نے انتخابی بورڈ کا رکن بنا دیا مگر ساتویں حضرت سعید بن زیدؓ کو آپ نے مستثنیٰ کر دیا، صرف

اس بنا پر کہ وہ آپ کے چچا زاد بھائی اور بہنوئی تھے، ورنہ وہ حضرت عمرؓ سے بھی زیادہ قدیم الاسلام اور سابق الایمان تھے۔ یہ فقط میرا ہی قیاس نہیں ہے، بلکہ متعدد علمائے سلف نے یہی لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے انہیں بر بناتے تو رزع و فتویٰ الگ رکھا کیونکہ وہ ان کے قرابت دار تھے۔ صحیح مسلم کی جن روایات کو اُد پر نقل کیا گیا ہے، ان سے ملتی جلتی ایک روایت مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب نہی من اکل الترم میں بھی موجود ہے جس میں حضرت عمرؓ کے ایک خواب کا ذکر ہے جس کی تعبیر یہ سمجھی گئی تھی کہ آپ کی موت کا وقت قریب ہے۔ آپ نے اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ بعض لوگ مجھے جانشین بنانے کے لیے کہتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ اپنے دین اور خلافت کو ضائع نہیں ہونے دے گا۔ اس حدیث کی شرح میں امام نوویؒ فرماتے ہیں:

جن چھ اصحاب کے نام حضرت عمرؓ نے تجویز کیے تھے، وہ عثمان، علی، طلحہ، زبیر، سعد ابن ابی وقاص اور عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہم تھے اور انہوں نے ان میں حضرت سعید بن زید کو شامل نہیں کیا حالانکہ وہ بھی عشوٰۃ بشرہ میں سے تھے، کیونکہ وہ ان کے اقارب میں سے تھے پس آپ نے انہیں شوریٰ میں داخل نہیں فرمایا جیسا کہ آپ نے اپنے صاحبزادے حضرت عبداللہ کو بھی نہیں شریک کیا۔

السنة عثمان وعلي وطلحة والزبير وسعد بن ابي وقاص وعبد الرحمن بن عوف و لسعد يدخل سعید بن زید معهم وان كان من العشرة لاند من اقرار بد فتورع عن ادخاله كما تواتر عن ادخال ابنه عبد الله رضی اللہ عنہم۔

اسی طرح بخاری، کتاب الحدود والمحارم میں، باب رجم الحبلی من الزنا میں ایک مفصل حدیث وارد ہے کہ حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا کہ ایک شخص کہہ رہا ہے کہ میں عمرؓ کے بعد فلاں شخص کے ہاتھ پر بیعت کروں گا۔ حضرت عمرؓ نے اس کو غضبناک ہو گئے اور فرمایا کہ میں ایسے لوگوں کو سخت تنبیہ کروں گا پھر فرمایا:

یہ وہ لوگ ہیں جو چاہتے ہیں کہ عاتقہ الناس کے حقوق غصب کریں... تم میں کوئی ایسا نہیں ہے جو ابوبکر کی طرح مرجع عوام پر جس نے بھی مسلمانوں سے مشورے کیے بغیر بیعت کی، اس بیعت کرنے والے کا فعل قابل قبول نہیں ہے، بلکہ وہ دوزخوں اپنے آپ کو قتل

هؤلاء الذين يريدون ان يعصبوهم امورهم... فیس منکم من تقطع الاعناق الیہ مثل ابی بکر من بايع رجلاً غیر مشورۃ من المسلمین فلا یبايع هو ولا الذی بايعه نغرة ان تقتلا۔

کے لیے پیش کر رہے ہیں۔

بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں نے حضرت ابن عمرؓ کو بھی انتخابی کونسل میں شامل کرنے کا مطالبہ کیا۔ تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ وہ مبصر کی حیثیت سے موجود رہیں مگر خلافت میں ان کا کوئی حصہ نہ ہوگا۔ میرے خاندان میں اگر عمرؓ برابر برابر چھوٹ جاتے تو غنیمت ہے۔ بخاری، فضائل اصحاب میں حضرت عمرؓ کا ارشاد یوں نقل ہوا ہے :

يشهدكم عيد الله بن عمر وليس له من الاما شي ع۔
تہاری مجلس میں عبداللہ بن عمرؓ حاضر تو رہیں گے مگر امارت میں سے انہیں کچھ نہ ملے گا۔

اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں :

اما سعيد بن زيد فهو ابن عم عمر فلم يستد عمر فيهم مبالغة في التنبري من الاما
سعید بن زید حضرت عمرؓ کے چچا زاد بھائی تھے، پس عمرؓ نے ان کا نام نہ لیا۔ یہ امارت کی ذمہ داری سے براہت میں مبالغہ و شدت کی بنا پر تھا۔

اسی مقام پر المدائنی کا یہ قول نقل کیا گیا ہے :

عده سعيد بن زيد فيمن توفي النبي صلى الله عليه وسلم وهو عنهم راض الا انه استثناء من اهل الثوري لقرابته منه۔
حضرت عمرؓ نے حضرت سعید بن زید کو ان اصحاب میں شمار کیا، جن سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بوقت وصال راضی تھے مگر حضرت عمرؓ نے انہیں اہل ثوری سے مستثنیٰ کر دیا۔ کیونکہ وہ آپ کے رشتہ دار تھے۔

امام ابن تیمیہؒ، منہاج السنہ، جلد ۳، ص ۱۶۸ پر فرماتے ہیں :

وعمر قد اخذ من الاما ابنه ولعمري دخل في الاما ابن عمه سعيد بن زيد وهو احد العشرة وهم من قبيلة بني عدی۔
اور حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے حضرت عبداللہ اور اپنے عم زاد سعید بن زید کو امیدوار ٹی امارت سے خارج کر دیا حالانکہ سعید عشرہ مبشرہ میں سے تھے جو بیعتی کہ وہ قبیلہ بنی عدی کے افراد تھے۔

اس کے منسلک بعد ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے اپنے قبیلے میں سے کسی کے سپرد کرتی جہدہ نہیں کیا۔ صرف ایک مرتبہ ایسا کیا مگر بعد میں اس والی کو بھی معزول کر دیا۔ یہی بات اس کتاب کے صفحہ ۱۳، ج ۳ پر بیان

کی گئی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ دونوں نے اپنی زندگی میں اپنے کسی عزیز کو منصب نہیں سونپا، نہ اُسے اپنے بعد جانشین بنایا، حالانکہ ان کی اولاد و اقارب میں فضلاء صحابہ موجود تھے۔

حضرت عمرؓ نے جو انتخابی شورائی مقرر کی تھی اس کے ارکان نے باہمی گفت و شنید کے بعد خلیفہ تجویز کرنے کا کام حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف کو تفویض کر دیا تھا۔ تاریخ طبری اور دوسری کتابوں میں جو تفصیلات درج ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبدالرحمنؓ نے اس ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ رائے عام کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ آپ نے گھروں میں جا کر پردہ نشین خواتین تک سے مشورہ لیا۔ مدینے کے باشندوں، طالب علموں اور باہر آئے ہوئے حاجیوں کی رائے معلوم کی۔ آخر کار انہیں اندازہ ہوا کہ لوگ حضرت عثمان کی طرف زیادہ جھکاؤ رکھتے ہیں۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ ہی کے ہاتھ پر بیعت عام ہوئی۔

حضرت عثمانؓ اپنے خاندان بنو امیہ کے حق میں فیاض تھے۔ آپ کا یہ قول مُسند احمد اور دوسری کتابوں میں منقول ہے کہ اگر میرے پاس جنت کی کبھی ہو تو میں اپنے خاندان کے آخری فرد تک کو دے دیتا کہ وہ جنت میں داخل ہو جائے۔ آپ کے خاندان کے بعض افراد نے محامرے میں آخر دم تک آپ کا ساتھ دیا۔ مگر اس کے باوجود حضرت عثمانؓ نے بھی اپنے خاندان کے کسی فرد کے حق میں استخلاف کی وصیت نہیں فرمائی۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد بعض صحابہ کرام حضرت علیؓ کے ہاں جمع ہوتے اور ان سے بیعت کرنی چاہی مگر حضرت علیؓ نے انکار کر دیا۔ جب آپ سے بار بار تقاضا کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ جب تک اہل شورائی اور اہل بدر میری خلافت پر اتفاق کا اظہار نہ کریں، اس وقت تک میری خلافت منقذ نہیں ہو سکتی۔ تاریخ طبری ج ۳، ص ۵۰ میں آپ کا یہ قول بھی منقول ہے :

فان بیعتی لانتکون حنفا ولا تکون الا
عن رضامن المسلمین۔
میری بیعت مخفی طریق پر نہیں ہو سکتی، اس کے لیے
مسلمانوں کی رضائے عام لازم ہے۔

پھر آپ نے سب لوگوں کو مسجد نبوی میں جمع ہونے کا مشورہ دیا اور مہاجرین و انصار صحابہ کی اکثریت نے آپ سے بیعتِ خلافت کی۔

حضرت علیؓ کی شہادت کے موقع پر جب آپ کی وفات کا وقت آپہنچا تو آپ سے دریافت کیا گیا کہ کیا

لہ مُسند احمد، مرویات عثمان میں ہے :

قال عثمان، دن بیدی صفتی الجنت لا اعطیتہا سی امیہ حتی یدخلوا من عند اخرهم۔

آپ کے بعد آپ کے صاحبزادے حضرت حسنؑ کے ہاتھ پر بیعت کی جاتے، آپ نے جو جواب دیا وہ طبری (ج ۲، ص ۱۱۲) میں درج ذیل الفاظ میں نقل کیا گیا ہے :

ما أمرکم ولا انھاکم۔ انتم البصر

میں نہ تمہیں اس بارے میں کوئی حکم دیتا ہوں، نہ منع

کرتا ہوں۔ تم خود مجھ سے بہتر فیصلہ کر سکتے ہو

چنانچہ حضرت علیؑ کے بعد جن لوگوں نے حضرت حسنؑ سے بیعت کی تھی اور جو حضرت معاویہؓ کے خلاف جنگ کے لیے نکلے تھے، ان سبے حضرت حسنؑ کو بطیب خاطر اپنی آزاد مرضی سے خلیفہ منتخب کیا تھا، اس میں حضرت علیؑ کی کسی خواہش یا ہدایت کو کوئی دخل نہ تھا۔

یہ ہے رئیسِ مملکتِ اسلامی کے تقرر کے معاملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلافتِ راشدہ کا تعامل اور صحابہ کرام کا اجماعی طرز عمل۔ اس مستند دستوری رواج سے جو بات قطعی طور پر ثابت ہے وہ یہ کہ خلیفہ المسلمین کا انتخاب عوام الناس کی مرضی پر موقوف و منحصر ہے اور کسی شخص کا بزور خلیفہ بننے کی کوشش کرنا اور پھر اپنے کسی قریبی عزیز کے حق میں جانشینی کا فیصلہ کر کے اپنی زندگی میں اس کی بیعت لے لینا کوئی مستحسن اور پسندیدہ عمل علماء کا اجماع اگر ہوا ہے تو اس بات پر ہوا ہے کہ اگر کوئی ایسا کر بیٹھے اور اس کو بدلنے کی کوشش موجب فتنہ ہوتی نظر آتے تو اسے برداشت کر لینا چاہیے، اور اس طرح بھی خلافت منعقد ہو جاتی ہے۔ مگر اس بات پر اجماع ہرگز نہیں ہوا ہے کہ اسلام میں یہ بالکل جائز و مباح طریقہ ہے اور خلافت خواہ شوریٰ اور انتخاب سے ہو، یا اس دوسرے طریقہ پر، دونوں اسلام کی نگاہ میں یکساں ہیں۔ اس مسئلے پر مفصل بحث آگے چلی کر ہوگی۔

تصحیح نیت کی بحث | اس اصولی و تمہیدی کلام کے بعد اب میں مولانا مودودی کی وہ عبارت نقل کرتا ہوں جسے مولانا عثمانی صاحب نے سب سے پہلے ہدفِ تنقید بنایا ہے۔ وہ عبارت "خلافت و طو کیت" ص ۱۰۵ پر ان الفاظ میں درج ہے :

”یزید کی دلی عہدی کے لیے ابتدائی تحریک کسی صحیح جذبے کی بنیاد پر نہیں ہوئی تھی بلکہ

ایک بزرگ و حضرت مغیرہ بن شعبہ، نے اپنے ذاتی مفاد کے لیے دوسرے بزرگ (حضرت

معاویہؓ) کے ذاتی مفاد سے اپیل کر کے اس تجویز کو جنم دیا اور دونوں صاحبوں نے اس بات

سے قطع نظر کر لیا کہ وہ اس طرح امت محمدیہ کو کس راہ پر ڈال رہے ہیں۔“

اس پر مولانا محمد تقی صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ ”جمہوریت کے محقق علماء ہمیشہ سے یہ تو کہتے آتے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ فعل راستے اور تدبیر کے درجے میں نفس الامری طور پر درست ثابت نہیں ہوا اور اس کی وجہ سے امت کے اجتماعی مصالح کو نقصان پہنچا مگر حضرت معاویہ کی نیت پر حملہ کرنے اور ان پر مفاد پرستی کا الزام عائد کرنے کا حق کسی کو نہیں ہے۔ وہ اپنے اس اقدام میں نیک نیت تھے اور انہوں نے جو کچھ کیا شرعی جواز کی حدود میں رہ کر کیا“ اس کے جواب میں میری پہلی گزارش یہ ہے کہ مولانا عثمانی نے مولانا مودودی کے موقف کی ترجمانی کرنے ہوتے ان کے محتاط الفاظ اور ملائم انداز بیان کو خواہ مخواہ سخت اور ناگوار الفاظ میں بدل دیا ہے۔ کسی کام کا صحیح جذبے کی بنیاد پر نہ ہونا اور کام کرنے والے کا نیک نیت نہ ہونا یا اس کی نیت کا مشہم ہونا دونوں صورتیں یکساں نہیں ہیں۔ اسی طرح کسی فرد کا ذاتی مفاد سے اپیل کرنا اور کسی فرد کا مفاد پرست ہو جانا دونوں میں بڑا فرق ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ میں کہوں کہ بعض صحابہ کرام سے سزقہ، شرب خمر یا زنا کا صدور بھی ہوا ہے اور عثمانی صاحب میرا قول یوں نقل کر دیں کہ صحابہ کرام چور، شرابی، زانی اور عیش پرست تھے۔ یا عثمانی صاحب یہ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں سے شرک و بدعت کا صدور ہو رہا ہے اور میں ان کی بات کو یوں نقل کروں کہ مسلمان عام طور پر مشرک اور متبدع بن چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح بات کچھ سے کچھ بن جاتی ہے۔

تاہم اگر جذبے اور نیت کے فرق کو نظر انداز کر دیا جاتے اور کسی کام کے صحیح جذبے پر مبنی نہ ہونے کا مطلب تصحیح نیت کا فقدان ہی لے لیا جاتے تب بھی ایک بنیادی سوال جو اس ضمن میں پیدا ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ نیت کے صحیح یا غیر صحیح ہونے کا لحاظ و اعتبار بہر انسانی فعل میں ہے یا کچھ خاص قسم کے افعال ہیں جن میں نیت کی صحت و عدم صحت معتبر ہے اور جن میں نیت کے فساد و صلاح کے مختلف حواقب و اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ میں نے اپنی حد تک اس مسئلے پر غور کیا ہے اور محدثین نے انما الاعمال بالنیات اور نکل اح و معاویہ وغیرہ احادیث کی تشریح میں جو کچھ فرمایا ہے، اس کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ اس معاملے میں جو کچھ میں سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ نیت کے وجود و عدم یا صحت و سفہم کا سوال صرف ان اعمال کے بارے میں پیدا ہوتا ہے جو عبادت و تقربات سے متعلق ہوں یا کم از کم شریعت کے اوامر و نواہی کی تعمیل کرتے ہوئے انجام پذیر ہوں۔ مثال کے طور پر کوئی شخص اگر ناز پڑھے یا زکوٰۃ دے یا حج کرے یا جہاد فی سبیل اللہ میں جانی و مالی قربانی دے تو ان میں نیت کا موجود یا مفقود ہونا اور اس کا صحیح یا غلط ہونا بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور ہر پہلو سے قابلِ اعتبار

ہے، کیونکہ ایسے افعال میں نیت کی اچھائی یا بُرائی سے آسمان و زمین کا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ فعل جو نظرِ ظاہر کیساں ہوں، ان میں سے ایک پر خبت واجب ہو اور دوسرا بالکل اکارت جائے، بلکہ اُلٹا موجبِ مواخذہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان افعال کے معاملے میں ہمیں حسنِ ظن کی تلقین کی گئی ہے اور زیادہ قیاس آرائی سے روکا گیا ہے، اگرچہ صریح شواہد و قرائن کی بنا پر نیت کو زیرِ بحث لانا قطعاً ممنوع بھی نہیں ہے۔ وہ امور جو عبادات کی قبیل سے نہیں ہیں اور جن کا مشروع اور مامور بہ ہونا کتاب و سنت نے ثابت نہیں ہے، بلکہ جو شرعیت کی رو سے غلط یا غیر مستحسن قرار پاتے ہیں، ان میں نیت یا جذبے کے صحیح یا غیر صحیح ہونے سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ اس طرح کے افعال جب زیرِ بحث آتے ہیں تو ناگزیر طور پر وہ امانہ اور عذبہ بھی زیرِ بحث آ جاتا ہے جس کے تحت وہ افعال سرانجام پاتے ہیں۔ یہ امر بالکل ظاہر اور بدیہی ہے کہ اس طرح کے محلِ نظر اعمال جب موضوعِ سخن بنتے ہیں تو ان کے حسن و قبح پر بحث کے دوران میں وہ جذبہ و محرک بھی لامحالہ کسی نہ کسی حد تک بیان میں آ ہی جاتا ہے جو ان میں کارفرما ہوتا ہے اور جو عملی روئے سے صاف طور پر مترشح ہو رہا ہوتا ہے۔ اس طرح کے اعمال میں اگر جذبات و محرکات کا ذکر آجاتے تو ذکر کرنے والے کا منہ یہ کہہ کر بند نہیں کیا جاسکتا کہ تم نیت پر حملہ کر رہے ہو جس کا تمہیں کوئی حق نہیں ہے۔ اگر غلط فعل کو غلط جذبے پر مبنی قرار دینے کا نام ”نیت پر حملہ“ ہے اور گناہ ہے تو پھر کسی دینی، علمی یا تاریخی موضوع پر کلام کرنے والا شاید ہی کوئی مسلمان ہوگا جو اس سے بچ سکا ہو۔ مولانا محمد تقی صاحب عثمانی اب تک جو کچھ سپردِ قلم کرتے رہے ہیں اگر اس پر ایک نگاہ بازگشت ڈالیں تو انہیں اس میں بھی اس چیز کے متعدد نمونے مل جائیں گے جسے وہ نیتوں پر حملہ“ قرار دے کر ممنوع ٹھہرا رہے ہیں۔ انسانی فعل اور مشینی حرکت میں آخر کچھ تو فرق ہوتا ہے اور پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ فعل نامحود و بالعموم جذبہ نامحود ہی کا ثمرہ ہوتا ہے۔

اس سے پہلے میں شاہ عبدالعزیز صاحب کے اقوال نقل کر چکا ہوں جن میں انہوں نے فرمایا ہے کہ امیر معاویہؓ کی بعض کارروائیاں خاندانی عصبیت سے متبراز تھیں۔ حضرت سعد بن عبادہ اور ابوسفیان کے متعلق بھی میں ابن تیمیہؒ کے اقوال درج کر چکا ہوں اور بہت سے دیگر اقوال بزرگانِ سلف کے پیش کیے جاسکتے ہیں جن میں انہوں نے بعض صحابہ کرام کے رویے پر ایسے الفاظ میں تنقید کی ہے جن کی زد جذبات و محرکات پر بھی لازماً پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر حافظ ابن عساکرؒ، حضرت فضیل بن عیاض کا ایک قول روایت کرتے

ہیں جسے ابن کثیر نے البدایہ جلد ۸ ص ۲۰ پر بھی نقل کیا ہے۔ قول یہ ہے :

معاویۃ من الصحابة، من العلماء اکبار و لكن ابتلی بحب الدنيا۔
معاویہ صحابی اور علماء کبار میں سے ہیں لیکن وہ حب دنیا میں مبتلا ہو گئے۔

اب مولانا عثمانی اگر چاہیں تو فرما سکتے ہیں کہ یہ امیر معاویہؓ پر دنیا پرستی کا الزام ہے اور ان کی نیت پر حملہ ہے جس کا تعلق کسی کو نہیں پہنچتا۔ لیکن عثمانی صاحب کو یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ حضرت فضیل ایک طرف ایسے صاحب تقویٰ و تودیع تھے کہ وہ صوفیائے کرام کے امام شمار کیے جاتے ہیں اور دوسری طرف وہ اتنے ثقہ اور صادق القول ہیں کہ صحیحین، سنن اور مسند شافعی سب میں ان کی روایات موجود ہیں۔

مولانا وحید الزمان صاحب حیدرآبادی نے تیسیر الباری ذرجمہ و تشریح البخاری کے متعدد مقامات پر امیر معاویہؓ کے متعلق لکھا ہے کہ ان کا دل اہل بیت سے صاف نہ تھا، جس طرح شاہ عبدالعزیز نے لکھا ہے کہ: "حركات اُدغالی از شائبہ نفسانی نبود"۔ یہ الفاظ بظاہر بہت سخت ہیں اور ممکن ہے کہ مولانا محمد تقی صاحب ان کو بھی نیت پر حملہ "قرار دیں۔ لیکن ان الفاظ کو نیت پر حملہ کہہ کر ان کا زبان و قلم سے صدور ممنوع بھنا اس وجہ سے درست نہیں کہ تاریخ و حدیث کی کتابوں میں متعدد واقعات ایسے مذکور ہیں جو اسی صورت حال پر صاف صاف دلالت کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر حضرت علیؓ و آل علیؓ پر سب و شتم ہی کے مسئلے کو لیجیے۔ یہ مذموم طریقہ جس طرح حضرت علیؓ کی زندگی اور ان کی وفات کے بعد تک جاری رہا اور حضرت حسنؓ اور حسینؓ کے مدینہ منتقل ہو جانے پر جس طرح امیر معاویہؓ کا گورنر مروان ان کے زور و زور و خطبوں میں ان پر لعن طعن کرتا تھا، اس کے بعد آخر دلوں کی صفائی کیسے باقی رہ سکتی تھی؟ پھر یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ امام حسنؓ کی خلافت سے دست برداری کے بعد بھی ان کی طرف سے امیر معاویہؓ اپنی طبیعت میں خلش محسوس کرتے تھے جو امام حسنؓ کی وفات ہی پر رفع ہوئی۔ ابو حنیفہؒ وینوری الاخبار الطوال ص ۲۲۲ پر لکھتے ہیں۔

وانتهی خبر وفاة الحسن الى معاوية،
کتاب به اليه عامله على المدينة مروان
حضرت حسنؓ کی وفات کی خبر امیر معاویہؓ کے عامل مدینہ
مروان نے ان تک پہنچائی۔ انہوں نے حضرت ابن عباسؓ
کو بلایا جو ان کے پاس شام میں آئے ہوئے تھے پس
امیر معاویہؓ نے ان سے اظہار سہمردی کیا اور امام حسنؓ
کی وفات پر خوشی ظاہر کی۔ اس پر ابن عباسؓ نے ان کے

الاقلیل۔

کہا کہ آپ ان کی موت پر خوش نہ ہوں۔ خدا کی قسم آپچی ان کے بعد زیادہ دیر زندہ نہ رہیں گے۔

اس کے بعد سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب فی جلود النور کی درج حدیث ملاحظہ ہو:

مقدم بن معدیکرب حضرت معاویہؓ کے پاس آئے تو حضرت معاویہؓ نے ان سے کہا کہ کیا آپ کو معلوم ہوا ہے کہ حسن فوت ہو گئے ہیں؟ مقدم نے کہا انا لشد وانا الیہ راجعون۔ ایک شخص مراد امیر معاویہؓ ہیں انے کہا کہ کیا آپ اسے ایک مصیبت قرار دے رہے ہیں؟ مقدم کہنے لگے کہ میں ان کی وفات کو کیوں مصیبت نہ سمجھوں حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنی گود میں بٹھایا اور فرمایا کہ یہ میرا ہے اور حسین علی کا ہے۔ قبیلہ بنو اسد کے فرد نے جو حضرت مقدم کے ہمراہ تھا، کہا کہ حسن ایک انگارہ تھا جسے اللہ نے بچا دیا۔

وقد المقدم بن معدیکرب الی معاویہ بن ابی سفیان فقال معاویہ للمقدم اعلمت ان المحسن بن علی توفی فرجع المقدم فقال له فلان انعدھا مصیبتہ۔ فقال له ولم لا اراها مصیبتہ وقد وضعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی حجرہ فقال هذا منی وحسین من علی۔ فقال الاسدی حجرۃ اطاقھا اللہ۔

اس روایت میں جہاں فلاں کا لفظ استعمال ہوا ہے وہاں مسند احمد میں معاویہ کا لفظ مروی ہے، جیسا کہ مولانا شمس الحق صاحب عون المعبود نے تصریح کر دی ہے۔ اس روایت کی تشریح میں مولانا موصوت فرماتے ہیں:

امیر معاویہؓ کے اس قول پر انتہائی تعجب ہے۔ انہوں نے اہل بیت کی قدر نہ پہچانی تھی کہ ایسی بات کہہ دی جس بن علی رضی اللہ عنہ کی وفات یقیناً بہت بڑی مصیبت تھی اور اللہ حضرت مقدم کو جزائے خیر سے اور ان سے راضی ہو کہ انہوں نے کلمہ حق ادا کرنے میں خاموشی اختیار نہ کی اور اسے علانیہ کہہ دیا۔ مومن کامل وخلص کی یہی شان ہے جو اس کے شخص نے جو کچھ کہا وہ معاویہؓ کی رضا اور تقرب حاصل کرنے کے لیے تھا۔ اُس نے یہ سخت گھٹیا بات اس وجہ سے

والعجب کل العجب من معاویہ فانہ ما عرف قدر اهل البیت حتی قال ما قال۔ فان موت مثل المحسن بن علی رضی اللہ عنہ فی اعظم المصائب وحزى اللہ المقدم ورضی عنہ فانہ ما سکت عن تکلم الحق حتی اظہرہ وهکذا شان المؤمن الکامل الخالص... فقال الاسدی طلیا لرضا معاویہ و تقریبا الیہ۔ انما قال الاسدی ذالک القول الشدید لضعف لان معاویہ رضی

اللہ عنہ کان یحذف علی نفسه من موال الخلفاء

امیر معاویہؓ کے سامنے کہی تھی کہ (امام حسنؓ کی موجودگی میں،
امیر معاویہؓ کو اپنی خلافت کے زوال کا خوف تھا۔

یہی العاط مولانا تحلیل احمد صاحب نے بذیل المجهود و شرح سنن ابی داؤد میں اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے درج فرماتے ہیں۔ وہ بھی لکھتے ہیں:

فقال الاسدی طلباً لرضاء معاویة وتقرباً

اسدی نے یہ بات معاویہؓ کی رضا اور تقرب حاصل کرنے
کے لیے کہی تھی جب حضرت مقدم نے اس شخص کی بات
سنی جو اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے
کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے امیر معاویہؓ کی خاطر داری
کے لیے کہی تھی، تو حضرت مقدم امیر معاویہؓ سے کہنے لگے کہ
میں یہاں سے آج ہرگز نہ ہوں گا جب تک آپ کو غصہ نہ
دلاؤں اور آپ کو ایسی بات نہ سناؤں جو آپ کو ناپسند ہو جس
طرح کہ آپ نے مجھے ایسی بات سنائی جو مجھے پسند نہیں۔

الیہ فقال المقدم حين سمع ما قال فی ابن بنت
رسول الله صلی الله علیه وسلم لمرأاة معاویة
اما انا فلا ابرح الیوم حتی اغیظک واسمعک
فیہ ما تنکرہ کما سمعتنی ما اکرہ۔

حدیث میں آگے بیان ہے کہ حضرت مقدم نے حضرت معاویہؓ کو قسم دلا کر پوچھا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے سونے کا زیور اور ریشم پہننے سے منع نہیں فرمایا اور خدا کی قسم یہ چیزیں آپ کے گھر کے لوگ استعمال کرتے ہیں اس
کی شرح میں صاحب بیعون المعبود فرماتے ہیں:

آپ کے گھر کے اور گھر کے مرد و زید وغیرہ، ان اشیاء کے
استعمال سے پرہیز نہیں کرتے اور آپان پڑیکیر نہیں کرتے
اور ادھر آپ حضرت حسن پر طعن کرتے ہیں۔

فان ابناءک ومن تقدر علیہ لا یجتزرون
عن استعمالها وانت لا تنکر علیہم وتطعن
فی الحسن۔

تاریخ و حدیث کی یہ روایات اور ان کی تشریح میں جو کچھ کہا گیا ہے، شاید مدیر البلاغ کے نزدیک یہ سب
نیتوں پر حملے کے مترادف ہو، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسے نیت پر حملے کا نام دے کر شرعاً ممنوع قرار دینا کسی
طرح صحیح نہیں ہے۔ درحقیقت ان میں نیت نہیں بلکہ ایک طرز عمل زیر بحث لایا گیا ہے جو غیر مستحسن اور
نامناسب تھا۔ ظاہر ہے کہ جب عمل پسندیدہ نہیں تھا تو جس جذبے یا جس نیت پر یہ عمل یعنی ہوگا، وہ جذبہ اگر
صنعتاً بحث میں آجائے اور اس جذبے کو غلط یا ناپسندیدہ بھی کہہ دیا جائے تو اس سے کیا قباحت لازم آتی ہے، اگر

یہ پابندی لگا دی جائے کہ کسی غلط یا قابل اعتراض قول و فعل کی غلطی واضح کرتے ہوئے اس جذبہ و ارادہ کی جانب مطلقاً کوئی اشارہ ہی نہ ہو جو اس قول و فعل کے پیچھے کار فرما ہے، تو اس کے دوسرے معنی تو یہ ہیں کہ پھر غلطی کو غلطی ہی نہ کہا جائے۔ غلط کام کی عدم صحت کو جب بھی بیان کیا جائے گا، اس میں کسی نہ کسی حد تک اس کا حرکت بھی آپ سے آپ بیان ہوگا۔ اس سے مفر ممکن ہی نہیں ہے تاہم میں سمجھتا ہوں کہ مولانا مودودی نے حضرت معاویہؓ پر یاد رکھنا صحابہ کرام کے جس قول و فعل سے بھی کتاب و سنت کی روشنی میں اظہار اختلاف کیا ہے تو وہ الفاظ اور محسوس انداز میں کیا ہے۔ براہ راست ان حضرات کی نیت کو زد میں لاتے ہوئے انہیں بد نیت یا مفاد پرست جیسے گستاخانہ القاب سے ہرگز ملقب نہیں کیا یہ مدیر البلاغ کی صریح دھاندلی ہے کہ وہ عائد المسلمین کو منحوس کرنے کے لیے اس طرح کے الفاظ گھڑ کر مولانا مودودی کی طرف منسوب کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر میں مولانا مودودی کی درج ذیل عبارت پیش کرتا ہوں جو انہوں نے خلافت و ملوکیت ص ۳۴۳ پر درج کی ہے:

”جن حضرات نے بھی تابعین عثمانؓ سے بدلہ لینے کے لیے خلیفہ وقت کے خلاف تلوار اٹھائی ان

کا یہ فعل شرعی حیثیت سے بھی درست نہ تھا اور تدبیر کے اعتبار سے بھی غلط تھا مجھے یہ تسلیم کرنے میں ذرہ برابر تامل نہیں ہے کہ انہوں نے یہ غلطی نیک نیتی کے ساتھ اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے ہوئے کی تھی مگر میں اسے محض غلطی سمجھتا ہوں۔ اس کو ”اجتہاد غلطی“ ماننے میں مجھے سخت تامل ہے۔“

کیا کوئی انصاف پسند اہل علم جو خواہ مخواہ سوتے طنن میں مبتلا نہ ہو، یہ کہہ سکتا ہے کہ مولانا مودودی کا یہ موقف حد شرع یا حد ادب سے تجاوز ہے اور اس قول کا قائل قصد کسی صحابی رسول کو (معاذ اللہ) بد نیت ثابت کرنا چاہتا ہے یا ان کی عدالت کو مجروح کرنے کا ارادہ رکھتا ہے؟ کیا علمائے اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ صحابہ کرام معصوم عن الخطا ہیں، ان سے کسی غلطی کا صدور سرے سے ممکن ہی نہیں ہے اور ان کے ہر قول و فعل پر اجتہاد کا

دبائی

اطلاق ہوتا ہے؟